© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

اقتصادیات میں اسلام کا موقف

اسلامی نقطۂ نظر سے ہم اقتصادیات کی کس تعبیر کو اسلام کی تعلیمات اور فلسفہ کی رُو سے صحیح قرار دے سکتے ہیں۔ یا وہ کون اقتصادی قدریں ہیں جن سے اسلام کا اقتصادی مزاج ترکیب پاتا ہے۔ یہ مسئلہ خاصہ پیچیدہ اور پہلو دار ہے۔ دوسرے الفاظ میں اشکال کی یہ نوعیت بیک وقت انسانی بھی ہے اور تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی بھی۔ اس کو سلجھانے کا بہترین طریق یہ ہے کہ فن و اصطلاح کی باریکیوں سے ہٹ کر اور بحث و نزاع کے مختلف فیہ اصول سے قطع نظر کر کے سب سے پہلے ہم اس کو فہم و تعبیر کی اس سادہ سطح پر لے آئیں جہاں ہر کوئی اس کی حقیقت کو جان بوجھ سکے۔ اور بغیر کسی جھمیلے میں پڑے اور مغالطہ کا شکار ہوئے یہ معلوم کر سکے کہ اس اشکال کا حل کیا ہے؟ اور جب اشکال اور اس کا حل معلوم ہو جائے تو پھر اس بات کا جائزہ لیں کہ موجودہ دنیا میں جو اقتصادی نظام رائج ہیں ان میں کون معقول ہے کون انسانی معاشرہ کو آگے بڑھانے والا ہے۔ کون اس دور کے تاریخی دھاروں کے ساتھ چلنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے اور کون ایسا ہے جو اس حل کی تائید فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اس حل کو ہم کس طرح اپنا سکتے ہیں اور کس طرح اس میں اسلامی فکر اور اسلامی روح کی تخلیقی نادرہ کاریوں کو سمو سکتے ہیں۔ یہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ ہم کسی بھی مسئلہ کے حل و کشود کے لیے محض تقلید کے قائل نہیں۔ ہمارے ذہن میں فروع و جزئیات کی توسیع اور ارتقا کے اپنے پیمانے ہیں۔ جن کو اختیار کیے بغیر تہذیب و ثقافت کی بوقلمونیوں کو ہم اپنا نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے نزدیک کسی بھی فلسفہ یا تصور کو جوں کا توں مان لینا خوبی نہیں۔ خوبی یہ ہے کہ اس میں ہماری طرف سے کچھ اضافے ہوں۔ ہم اس میں اپنا رنگ بھریں۔ اور اسلام کی ان جمالیاتی اور روحانی قدروں سے اس کو آشنا کریں، جو اس کے حسن و افادیت کو چار چاند لگا دینے کا موجب ہوں۔ تقلید مردہ قوموں کا شیوہ ہے اس کے معنی مایوسی کے ہیں۔ زندہ قومیں فکر و اختراع کے عمل سے کبھی بھی محروم نہیں ہوتیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسئلہ کی نوعیت

زیر بحث اشکال کی وہ کون سادہ اور عام فہم سطح ہے جہاں یہ اشکال اشکال نہیں رہتا۔ اس کو معاشرہ کے موجودہ تضاد میں تلاش کرنے کی کوشش کیجیے۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام انسان شرفِ انسانیت میں برابر ہیں۔ جب سب کی ضرورتیں یکساں احترام کے لائق ہیں یعنی جب ہر شخص کی جسمانی اور ذہنی توانائیوں کی پرورش کے لیے عمدہ غذا درکار ہے جب سب کو ایسے صحت مند ٹھکانہ کی ضرورت ہے کہ جس میں وہ زندگی کے دن اطمینان سے گزار سکے۔ جب سب کی صحت مناسب دوا اور علاج کی سہولتوں سے بہرہ مندی کی طالب ہے۔ اور سب کی روحانی و اخلاقی یا فنی تربیت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کے لیے بغیر کسی امتیاز کے دانش گاہوں کے دروازے کھلے رہیں تو پھر یہ کیا اندھیر ہے کہ ہمارے ہاں ان حقائق سے قطع نظر ایک ہی انسانی معاشرہ دو مختلف خانوں میں بٹا ہوا ہے اور ایک ہی تصویر کے دو متضاد رُخ نمایاں ہیں۔ ایک گروہ کو تو نہ صرف زندگی کی تمام سہولتیں حاصل ہیں، بلکہ وہ تعیش اور تمول کے اس مقام پر فائز ہے کہ جہاں دولت کی فراوانی اس کو اخلاق کے حدود سے تجاوز کر کے گناہ و معصیت کی وادیوں میں لا ڈالتی ہے۔ اور دوسرا گروہ نانِ شبینہ تک سے محتاج ہے۔ ایک گروہ سربفلک محلات اور بڑی بڑی کوٹھیوں میں براجمان ہے۔ اور دوسرے کو تنگ و تاریک کوٹھڑی بھی میسر نہیں۔ ایک گروہ کو اعلیٰ سے اعلیٰ طبی سہولتیں حاصل ہیں۔ اور دوسرا گروہ بیماری کی حالت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گھلنے اور جان دے دینے پہ مجبور ہے۔ ایک کے لیے بیرونی ممالک کی اونچی سے اونچی یونیورسٹیوں کی آغوش وا ہے اور دوسرا اتنی سکت بھی نہیں رکھتا کہ ابتدائی تعلیم کے مرحلے ہی طے کر سکے۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ انسان میں درجہ اور منصب کے ان مہیب فاصلوں کے لیے کیا وجہ جواز پائی جاتی ہے۔ زندگی کے اس عظیم تفاوت میں ستم ظریفی کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اسی طبقے کے مقدر میں محرومیوں کی یہ داستان رقم ہوئی ہے جس کے دستِ جمال آشنا نے تہذیب و تمدن کی طرفہ طرازیوں کو جنم دیا ہے، جس کی محنت اور عرق ریزی سے زندگی کے شگوفے پھوٹے اور پھول مہکے ہیں، جس نے اپنے خون سے اس دبستان کی آبیاری کی ہے جو جان جوکھوں میں ڈال کر دیوہیکل مشینوں سے نبرد آزما ہوا ہے، جس نے کڑاکے جاڑوں اور قیامت کی تپش سے لڑنے میں ساری عمر گزار دی ہے اور جس نے زمین کا سینہ چیر کر اولادِ آدم کے لیے عمدہ اور لذیذ کھانوں کا اہتمام کیا ہے۔ اور فائز المرام گروہ وہ کاہل اور احدی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے قالین اور صوفوں پر بیٹھ کر محض ٹرک، چالبازی اور ہوشیاری سے دولت کے تمام ذرائع پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔

قابلِ فہم حل

ظاہر ہے اگر معاشرہ میں یہ خلل، یہ تضاد اور فرق و امتیاز کی یہ ہولناک دیوار یں انسانیت کو دو حریف گروپوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ تو یہ محض بخت و اتفاق کی کارفرمائی نہیں۔ یہ نظامِ معیشت کا بگاڑ اور عدل و انصاف کے قاعدوں سے انحراف ہے اور اس کا سادہ اور قابل فہم حل یہی ہے کہ معاشرہ کو از سرِ نو عادلانہ اساس پر ترتیب دیا جائے اور اس ڈھب سے ترتیب دیا جائے کہ اس میں ناہمواری کی یہ خرابیاں نہ رہیں۔ دولت اور ذرائع دولت کی تقسیم اس اسلوب سے ہو کہ سب کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوں۔ سب کو صحت بخش غذا ملے، سب کا اپنا ٹھکانہ ہو، سب علاج معالجہ کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں اور سب کو ترقی کا موقع ملے اور معاشرہ کا کوئی گروہ اس پوزیشن میں نہ رہے کہ ان کے ان بنیادی حقوق کو غصب کر سکے۔

یہ ٹھیک ہے کہ سب انسان ذہن، فکر اور کارگزاری کے اعتبار سے یکساں مرتبہ کے حامل نہیں۔ اور نہ تعلیم و تربیت کے لحاظ ہی سے سب برابر ہیں۔ صلاحیتِ کار اور ذہن کا یہ اختلاف بالکل قدرتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس اختلاف کی بنا پر ان لوگوں کی کارگزاری کا صلہ بہرحال ان لوگوں سے زیادہ ہونا چاہیے جو ان صلاحیتوں سے محروم ہیں:

قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون (زمر: ۹)

بنیادی ضروریات کی تکمیل

اس صورت میں کوئی بھی معقول انسان مساوات کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مطالبہ صرف یہ ہے کہ جب انسان شرفِ انسانیت میں برابر ہیں اور جب ان کی مادی ضروریات یکساں ہیں تو کیوں نہ ان بنیادی ضروریات کی حد تک سب کو برابر کی آسائشیں حاصل ہوں۔ سوال فرق و تفاوت کو نظر انداز کرنے کا نہیں سوال یہ ہے کہ تفاوت کا آغاز کس نقطہ سے ہو؟ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک اچھی غذا، مناسب طبی امداد اچھے مکان اور اونچی تعلیم کے امکانات کا تعلق ہے اس میں تو کسی شخص سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو اس کی قابلیت اور صلاحیتِ کار کے مطابق صلہ بھی ضرور ملنا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان دونوں باتوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے کہ ہر شخص کو وہ سب کچھ ملنا چاہیے، جس کا وہ فطری طور پر انسان ہونے کی حیثیت سے حق دار ہے اور وہ سب کچھ بھی عطا ہونا چاہیے جس کا یہ اپنی قابلیت، محنت اور کارگزاری کے لحاظ سے سزاوار ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں اپنی جگہ اتنی واضح، اجلی اور صحیح ہیں کہ ان میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یعنی جہاں فطرت نے تمام انسانوں کو یکساں شرفِ انسانیت سے نوازا ہے اور تمام انسانوں کی ضروریات کا یکساں احترام ضروری قرار دیا ہے، وہاں سب میں قابلیت، استعداد اور تربیت کا ذوق بھی قائم رکھا ہے۔ اس لیے جہاں یہ ظلم ہے کہ معاشرہ کا ایک حصہ تو دنیا بھر کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور دوسرا حصہ جو بھاری اکثریت میں ہے، زندگی کی ابتدائی ضروریات تک کو پورا کر لینے کی استطاعت سے محروم ہو۔ وہاں یہ بھی ظلم ہے کہ کسی شخص کے ساتھ اس کی قابلیت اور صلاحیت کار کے مطابق سلوک نہ روا رکھا جائے

منصوبہ بندی کی اہمیت

جب یہ بات فہم و فکر کی گرفت میں آ چکی کہ موجودہ معاشرہ کس معاشی تضاد میں مبتلا ہے اور اس کا کیا حل پذیرائی کے قابل ہے تو اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ اقتصادیات کا یہ منصفانہ نقشہ کیونکر ترتیب پذیر ہو جو اس حل کو عملی شکل میں ڈھال دے جو انسانی حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے جو فرق و امتیاز کی غیر طبعی دیواروں کو گرا دے۔ جو کھوئے ہوئے شرفِ انسانی کو پھر سے لوٹا دینے کا ضامن ہو جو ہر شخص کے لیے بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کا کفیل قرار پائے اور ہر شخص کے ساتھ اس کی صلاحیت کار کے مطابق سلوک روا رکھنے کی ذمہ داری قبول کرے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جو سادے اور سمجھ میں آنے والے اقتصادی تصوّر پر مبنی ہو۔

جب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا کہ موجودہ معاشرہ میں شدید اقتصادی ناہمواری ہے اور یہ کہ اس کا بہرحال تدارک ہونا چاہیے، تو اس حقیقت کے پا لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنی چاہیے کہ یہ غیر منصفانہ ناہمواری اور حدود و امتیاز کا یہ ہولناک فرق محض اس بنا پر معاشرہ میں ابھرا ہے کہ ذرائع پیداوار پر صرف ایک ہی طبقہ قابض ہے اور معاشرہ کی عظیم اکثریت مجبور ہے کہ ان کے ظلم و استحصال کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اور اگر معاشیات کو اس اسلوب سے ترتیب دیا جائے کہ دولت اور اس کے ذرائع پر ایک ہی طبقہ قابض نہ رہے بلکہ پوری قوم اس میں شریک ہو۔ اور اجتماعی ملی سطح پر سرمایہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی منصوبہ بندی (PLANING) کی جائے تو ناہمواری کی موجودہ شکل باقی نہیں رہے گی کیونکہ اس صورت میں ملت اس پوزیشن میں ہوگی کہ سب کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اور دیکھ سکے کہ ملت کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت کے ارتقا کے لیے اقتصادی لحاظ سے وہ کس حد تک آزاد ہے۔ مکمل اور سائنٹفک منصوبہ بندی اس بات کی مقتضی ہے کہ ذرائع پیداوار پر بڑی حد تک ملت کو قابو حاصل ہوتا کہ وہ ملی مصلحتوں کے مطابق اس کو صرف کر سکے اور اگر ایسا نہیں ہو پاتا اور سرمایہ بہرحال چند ہاتھوں، چند خاندانوں اور طبقوں ہی میں سمٹ کر رہ جاتا ہے، تو پھر معاشرہ میں ناہمواری اور تضاد کا رہنا ناگزیر ہے کیونکہ اس صورت میں دو ہی طبقے تو ہوں گے جو زندگی کا تانا بانا تیار کریں گے۔ ایک حکومت جو منصوبہ بندی کی خواہاں ہوگی لیکن ذرائع پیداوار پر قابض نہ ہونے کی وجہ سے یہ اس لائق نہیں ہوگی کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکے اور دوسرے سرمایہ دار جو یہ چاہیں گے کہ ان کا سرمایہ اور بڑھے اور ان کی دولت اثر و رسوخ میں اور اضافہ ہو۔ اغراض و مقاصد کے اس اختلاف کا یہ منطقی نتیجہ نکلے گا کہ معاشرہ میں ناہمواری ظلم اور استحصال کی کوششیں بغیر کسی روک ٹوک کے بدستور جاری رہیں گی۔

جب معاشرہ کا وجود وا شکال واضح ہو گیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کو حل کرنے کی معقول شکل کیا ہے؟ تو اب بحث و نظر کی عنان کو اس سوال کی طرف موڑ دینا مناسب ہوگا کہ وہ کون سا اقتصادی نظام ہے جو اس حل کو پیش کرتا ہے اور یہ کہ اس میں فوائد اور نقائص کا تناسب کیا ہے۔ کون نظام اس لائق ہے جو معاشرہ کو آگے بڑھا سکے، موجودہ عصری تقاضوں کو پورا کر سکے اور تہذیبی اور انسانی نقطہ نظر سے زیادہ معقول اور زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت

بغیر کسی اختلاف اور موشگافیوں میں پڑے ہم دو ہی معاشی نظاموں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ جو آئندہ چل کر ہماری جانچ پرکھ اور تنقید و تفحص کا ہدف بن سکتے ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت یہی وہ دو مختلف مدارسِ فکر ہیں، جن کے باعث آج دنیا دو حریف ٹیموں میں بٹی ہوئی ہے اور جن میں ایک کو بہرحال، مشروطاً یا غیر مشروط طور پر مسائل زیر بحث کے حل و کشود کی خاطر منتخب کیا جا سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم بحث و نظر کی گہرائیوں میں اتریں، اس مرحلہ پر اس سوال کا جواب دے دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا اسلام کا اپنا کوئی معاشی نظام نہیں ہے اور کیا ہم اسے تیسرا معاشی نظام نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرار دے سکتے۔ جب ہم معاشی نظام کا ذکر کریں گے اور اس سلسلہ میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کا نام لیں گے تو قدرتاً یہ سوال اُبھر کر سامنے آئے گا کہ اس سلسلہ میں اسلام کے معاشی نظام کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟ اس سوال میں وزن اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم اسلام کے بارہ میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ ایک جامع مذہب ہے اور اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

اسلام کی جامعیت کا مفہوم

جب ہم اسلام کے بارہ میں جامع دین کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں تمام انسانی اشکالات کا حل موجود ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس میں ہر ہر سوال کا پہلے سے ڈھلا ڈھلایا جواب موجود ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس میں اصولی طور پر ان تمام قدروں کی وضاحت کر دی گئی ہے جن کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل پر غور و فکر ہو سکتا ہے اور ہر ہر دور میں، تعبیر و تشریح کی ایسی شکل اختیار کی جا سکتی ہے، جو اس عصر کی روح کے عین مطابق ہو۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس میں پہلے سے فکر و اجتہاد کی وہ تمام تر بنیادیں پائی جاتی ہیں، جن پر تہذیب و تمدن کے ایوانوں کی تعمیر نو ممکن ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ فقہ، تصوف، اور علم الکلام ایسے اہم مضامین جن کی تکمیل و ارتقا کے لیے انسانی فکر و اجتہاد کو تین چار سو سال تک مصروف رہنا پڑا، اسلام کے مضمرات میں پہلے سے موجود تھے۔ یعنی اس کی فقہ کی اساس اپنی ہے، تصوف کی بنیاد اپنی ہے اور علم الکلام کا سرچشمہ اپنا ہے۔ اور یہ تمام علوم اسلام کے اپنے انہی اندرونی تقاضوں کے بل پر اُبھرے اور پروان چڑھے ہیں، بیرونی محرکات کے نتیجے کے طور پر یہ معرض وجود میں نہیں آتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتابِ اسلام کی ضوفشانیوں کا دائرہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس میں ہنوز متعدد آفتاب پنہاں ہیں۔ جنھیں سیاست، تمدن اور اقتصادیات کے افلاک پر چمکنا اور دنیا کو نئی روشنی سے آشنا کرنا ہے۔

یعنی اسلام ان معنوں میں جامع دین ہے کہ اس میں فکر و اجتہاد کی گنجائشیں کبھی ختم نہ ہوں گی اور ہر ہر زمانہ میں تازگی اور تجدید کا عمل جاری رہے گا اور اہل علم و دانش اپنے اپنے دور کے مسلمات اور تقاضوں سے نمٹنے کے لیے اس بحر ناپیدا کنار میں غواصی کر سکیں گے۔ اور نئے نئے موتیوں سے اپنا دامنِ طلب بھر سکیں گے۔ اسلام کے جامع اور مکمل دین کے معنی یہ کبھی نہ تھے کہ انسانیت اور معاشرہ کو جتنا آگے بڑھنا تھا، بڑھ چکا اور ارتقائے دنیا سے متعلق جتنے سوالات پیدا ہونے تھے پیدا ہو چکے اور ان تمام سوالات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا بنا بنایا جواب کتاب و سنت کے دفاتر میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اجتہاد
وبصیرت کے لیے اس میں تمام امکانات موجود ہیں، جن سے ہر ہر دور کے مجتہدین استفادہ کر سکتے ہیں۔
اور فقہ، اصول، تصوف، علم الکلام، سیاست اور اقتصادیات کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

دین جامع کی اصطلاح، دراصل اس معنی کے لیے وضع ہوئی کہ اس میں روح و جسم، فرد و
معاشرہ اور دین و دنیا کے معاملہ میں وہ دوئی یا ثنویت (DUELISM) پائی نہیں جاتی جو راہبانہ مذاہب
کا طرۂ امتیاز ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کی افادیت کا دائرہ زندگی کے تمام گوشوں کو گھیرے ہوئے ہے

اس مختصر وضاحت کے بعد، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلام کا موقف اس طرح
منطبق ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت معاشی نظاموں کے مقابلہ میں حریف کی نہیں جج یا منصف کی ہے لہٰذا
اسے ان دونوں نظام ہائے فکر پر تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں کس کو کس حد تک اور
کن شرائط کے ساتھ ہمیں قبول کرنا چاہیے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فن اور اصطلاح کی زبان میں ہم اسلام
کو اس بنا پر مخصوص اقتصادی نظام قرار نہیں دیتے کہ اسلام کا تعلق کسی فن سے زیادہ زندگی کے حقائق سے
ہے، اخلاق و سیرت سے ہے، روح و باطن اور تعلق باللہ سے ہے اور اقتصادیات محض ایک سائنس
ہے۔ پھر جس طرح ریاضی اور ٹیکنالوجی کی تقسیم اسلامی اور غیر اسلامی کے دو خانوں میں بے معنی ہے۔ اسی
طرح اقتصادیات کی تقسیم بھی اسلامی اور غیر اسلامی کی اصطلاحوں میں بے معنی ہے۔ البتہ جس طرح طبیعیات
ریاضی اور ٹیکنالوجی کے نتائج اور انکشافات کو ہم اسلامی نقطہ نظر سے جانچتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ
ان سے کائنات کے بارہ میں ہمارے مسلمات کس حد تک متاثر ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہم اقتصادیات کے
موجودہ نظریات کے بارہ میں بھی سوچیں گے کہ ان میں کون روح انسانیت یا نظریہ توحید اور عدل و اخوت
کے زیادہ قریب تر ہے اور ہم کس طرح اس کو اسلامی سانچے یا اسلامی رنگ اور روپ میں پیش کر سکتے ہیں۔

سرمایہ داری کا آغاز اور تہذیبی ترقی

سرمایہ داری کا آغاز ہزاروں برس پھیلے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے اس مرحلہ سے ہوتا ہے جب
اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں مغرب میں صنعتی انقلاب رونما ہوتا ہے۔ جب زرعی تہذیب کے بطن
سے ایک نئے عہد کی داغ بیل پڑتی ہے۔ جب تہذیب ہرے بھرے کھیتوں سے نکل کر عالیشان کارخانوں
داخل ہوتی ہے۔ زرعی تہذیب نے جہاں بڑے بڑے فلسفوں اور مذہبی نظریات کو جنم دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہاں دو مضر انسانیت برائیاں بھی بطور یادگار کے چھوڑیں۔ غلامی اور پادشاہت۔ اور اس کے بطن سے تولّد ہونے والے نظام سرمایہ داری نے جاگیرداری کی چھوڑی ہوئی ان دو نشانیوں کو نہ صرف سینے سے چمٹائے رکھا بلکہ اُن کو جلا دی، نیا رنگ ڈھنگ بخشا اور ایسے حسین طریق سے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا کہ سب اس کو ہنسی خوشی گوارا کرنے لگے۔ جس طرح اپنے عہد میں جاگیرداری کا ترقی پسندانہ کردار ہے، اسی طرح سرمایہ داری نے بھی گزشتہ دو تین صدیوں میں کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت تہذیب و تمدن کا جو بھی شکوہ و جلال ہے۔ سائنس اور علوم و فنون میں جو بھی حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں۔ سب اسی نظام کا کرشمہ ہے تو اس میں ذرا بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں، بنکوں کی عظیم الشان عمارتیں، پوری دنیا میں پھیلا ہوا وسیع تر مواصلات کا نظام، بنگلے کوٹھیاں اور رہن سہن میں سلیقے اور شائستگی کا احساس اور برق و کہربا کی ضیا افروزی۔ کس کس چیز کو گنایئے گا۔ ان سب کو سرمایہ اور دولت کی فراوانیوں نے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اگر سرمایہ کثیر مقدار میں جمع نہ ہوتا اور پھر یہ سرمایہ مزید سرمایے کو جنم دینے کی باقاعدہ صورت اختیار نہ کرتا تو ظاہر ہے تہذیب و تمدن کے یہ عظیم منصوبے کبھی پروان نہ چڑھتے۔ اس نظام نے یورپ کے بنیوں کو یہ نکتہ سمجھا دیا تھا کہ سرمایہ سرمایہ کو پیدا کرتا ہے، بڑھاتا ہے اور ترقی کی اس منزل تک پہنچا دیتا ہے کہ جہاں تھوڑی سی توجہ سے یہ آپ سے آپ پھلتا پھولتا اور وسعت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ مغرب نے اس نظام کی بدولت جب جاگیرداری کے رسم و رواج سے چھٹکارا پایا اور دولت و زر کے معجزوں کو آزمایا اور یہ دیکھا کہ اس کی وجہ سے ان کے اقتدار و استعمار کا دائرہ روز بروز پھیل رہا ہے تو اس کی تائید میں فلسفہ، اجتماعیات اور ریاضی و منطق کے دروازوں پر دستک دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی تائید میں دلائل و براہین کا انبار لگا دیا۔ ولیم پیٹی (۱۶۲۳-۱۶۸۷ء)، آدم سمتھ (۱۷۲۳-۱۷۹۰ء) اور ڈیوڈ ریکاڈو (۱۷۷۲-۱۸۲۳ء) نے اس کو ایک خاص نظام کی شکل میں ڈھالا اور اس کے اغراض و مقاصد اور اصول و فروع کو ترتیب دیا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اساس

اس کی بنیاد اس نظریہ پر استوار ہے کہ ہر شخص کو اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے سرمایہ کا استعمال کر سکے اور نفع آفرینی کے جس جس انداز کو مناسب سمجھے، کاروبار میں آزادانہ اس کو استعمال میں لا سکے۔ آزادیٔ کاروبار (LAISSER-FAIRE) کا یہ اصول بظاہر نہایت معقول اور جمہوری نظر آتا ہے۔ مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معقولیت اور جمہوریت کی یہ جھلک صرف نظریہ کی حد تک سمجھ میں آنے والی ہے۔ جب اس پر عمل ہوتا ہے تو نتیجہ اس کے برعکس نکلتا ہے یعنی وہ لوگ جن کے پاس زیادہ سرمایہ ہے وہ پہلے مسابقت کے ذریعہ اور پھر اجارہ داری قائم کرکے چھوٹے سرمایہ کاروں کو میدان سے نکال باہر کرتے ہیں اور اس طرح سرمایہ کاری کی تمام تر صلاحیتیں، چند خاندانوں اور گروہوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اور انسانوں کی باقی عظیم اکثریت مجبور ہو جاتی ہے کہ وہ اجرت پر کام کرے اور اپنی ذہنی اور جسمانی توانائیوں کو روز کی روٹی کے عوض بیچ ڈالے۔ مقابلہ اور اجارہ داری نظام سرمایہ داری کے وہ ضروری لازم ہیں، جن سے چھٹکارا پانا محال ہے اس سے اتنا فائدہ تو بلا شبہ حاصل ہے کہ پیداوار کی نوعیت نسبتاً زیادہ بہتر ہو جاتی ہے لیکن اس سے چھوٹے سرمایہ کار تباہ ہو جاتے ہیں۔ بے کاری بڑھ جاتی ہے اور دولت کی فراوانیاں، اقتدار و اختیار کے فوائد گھوم پھر کر بڑے سرمایہ کاروں کی جھولی میں آگرتے ہیں اور یہ اپنے وسیع تر اثر و نفوذ کی بدولت اس پوزیشن میں ہو جاتے ہیں کہ انسانی آبادی کی بہت بڑی اکثریت کی آزادی کو اس حقیر معاوضہ کے بدلے خرید لیں جو بمشکل ان کو زندہ رکھ سکے۔ ان حالات میں یہ ناممکن ہوتا ہے کہ کارکنوں کا یہ گروہ تہذیب و تمدن کی آسائشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام ان کو زندگی کے جس بھنور میں ڈال دیتا ہے اس سے یہ نکل ہی نہیں سکتے اور یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر لینے کے علاوہ بھی کوئی تہذیبی، دینی، اخلاقی تقاضا ہے جس کی تکمیل ضروری ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں یہ صورتِ حال اس غلامی کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کو جاگیرداری نظام نے بطور ورثہ کے چھوڑا تھا یعنی پرانے زمانے میں جس طرح غلام شب و روز مالک کے فائدہ کے لیے کام کرتا تھا اسی طرح اس دور میں کارکن اور مزدور کارخانہ دار کے بینک بیلنس کو بڑھانے اور اس کی تجوریوں کو مال و دولت سے بھرنے کی غرض سے محنت شاقہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام یکسر جامد اور غیر متحرک نظام ہے یا اس کا مزاج اور فطرت غیر متبدل ہے۔ جب سرمایہ، اجارہ داری کے خانہ میں داخل ہوتا ہے یا بہت سی اجارہ داریاں مل کر ایک بڑے اجارہ دا نظام حقیقت میں منسلک ہوتی ہیں تو اس کی فطرت اور کردار میں چپکے سے اجتماعیت اور اشتراکیت کے عناصر آداخل ہوتے ہیں۔ یعنی اس صورت میں سرمایہ نجی حدود سے نکل کر نسبتاً زیادہ وسیع دائرے میں تگ و تاز شروع کر دیتا ہے۔ سرمایہ کاری کے ارتقا کا یہی وہ پہلو ہے کہ جس کا ٹائن بی نے یہ کہہ کر

© rasailojaraid.com

اعتراف کیا ہے کہ "سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا نے مجبور کر دیا ہے کہ ہم اشتراکیت کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کر لیں[۵۱]"۔ برٹش لیبر پارٹی کے ایک لیڈر جان سٹریچی نے بھی اس حقیقت کو مانا ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نے اشتراکی تصور کو اپنا لیا ہے[۵۲]۔ بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تعمیر و ترقی میں چونکہ اصولاً یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسائل کے بل پر زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے، اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ سرمایہ کاری کی انفرادی صلاحیتوں کو کسی ایک اجتماعی نظامِ معیشت میں منسلک کیا جائے اور پھر جب متعدد مالی ادارے اور اجارہ دارانہ طبقے ایک تنظیم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اس ادارہ اور تنظیم کا مزاج اور کردار آپ سے آپ بدل جاتا ہے۔ اب صورتِ حال یوں بدل جاتی ہے کہ بجائے ایک خاندان اور ایک گروہ کے متعدد مالی ادارے مل جل کر وسیع پیمانے پر سرمایہ اور پیداوار کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ یعنی سرمایہ اور پیداوار میں ایک طرح کی اجتماعیت اور اشتراکیت ابھر آتی ہے۔

ان حالات میں چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے، اس لیے سرمایہ دار اور مزدور کے مابین ربط و تعلق کی نوعیت میں تضاد بھی زیادہ واضح اور قوی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سرمایہ دار کے رویہ میں لچک پیدا ہوتی ہے اور نام نہاد اور صد درجہ ناکافی اصلاحات کی داغ بیل پڑتی ہے۔ یعنی مزدوروں کے اس حق کو اصول کی حد تک تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اُجرت کے علاوہ نفع میں بھی ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ انھیں باقاعدہ بونس دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے گریجوٹی اور انشورنس کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور بعض ترقی یافتہ ممالک میں تعلیمی اور طبی سہولتوں کی فراہمی کے ساتھ کچھ شیئرز بھی ان کے لیے مخصوص کر دیے جاتے ہیں لیکن ان تبدیلیوں کا فائدہ آخر [illegible] میں سرمایہ داروں کی تنظیم ہی کو پہنچتا ہے۔ انباروں اور انفرادی سرمایہ میں سے چند سکے اگر کارکنوں کی جیب میں جاتے ہیں یا یہ چند سہولتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں تو اس کی بہت بڑی مقدار بہرحال سرمایہ داروں کے کھاتہ میں جمع ہوتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اس وقت زیادہ بھیانک روپ دھار لیتا ہے جب حکومت اس کی سرپرستی اختیار کر لیتی ہے اور ذرائع پیداوار کے دروبست پر اس کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔

۵۱۔ یو۔ ایس۔ نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ مارچ ۳۰، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰

۵۲۔ کنٹمپرری کیپٹلزم [illegible] لندن ۱۹۵۸ء، ص [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ معاشرہ میں چونکہ حقیقی انقلاب رونما نہیں ہوتا، اور طبقاتی شعور واضح اور متعین تحریک کی شکل اختیار نہیں کر پاتا، اس لیے یہ حکومت ملک کے اندر ابھرنے والے تضادات کو رفع کرنے میں تو کیا کامیاب ہوسکتی ہے الٹے اس کے استحصال کا دائرہ دوسرے ممالک تک وسیع ہوجاتا ہے اور اس طرح وہ جارحانہ حکومت کے بطن سے امپیریلزم جنم لیتا ہے جو کمزور ممالک میں اپنے استعمار اور اثر و رسوخ کا اس غرض سے جال پھیلا دیتا ہے تاکہ یہ ممالک اس کے لیے خام مال مہیا کرسکیں اور اس کی مصنوعات کی برآمدات کے لیے بہترین منڈی ثابت ہوسکیں۔

(باقی آئندہ)

مسلمانوں کے عقائد و افکار

از: علامہ ابوالحسن اشعری ——— ترجمہ: مولانا محمد حنیف ندوی

یہ علامہ ابوالحسن اشعری کی مشہور تصنیف مقالات الاسلامیین کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں متکلمینِ اسلام کی ان فکری و کلامی کاوشوں کا مفصل تذکرہ ہے جو کہ تین صدیوں تک مسلمانوں کے علمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا موضوع بنی رہیں۔ طبیعیات کی طرفہ طرازیوں سے لے کر اخلاقیات اور فقہ و قانون کے دقیق مسائل تک کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس میں ذرہ کے بارے میں نکتہ سنجیاں بھی ہیں، فلسفہ و الٰہیات سے متعلق چشم کشا بحثیں بھی ہیں اور دیگر نوادرِ علمیہ بھی۔ یہ دراصل علم الکلام کی انسائیکلو پیڈیا ہے جس نے مسلمان متکلمین کی تمام فکری کاوشوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

مقدمہ میں فاضل مترجم نے ان افکار کے پس منظر پر پوری پوری روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر فکری تگ و تاز کا محرک اصلی عرفانِ صفات کا مرکزی جذبہ تھا، یونانی علوم کا اثر و نفوذ نہیں۔ نیز مترجم نے ان دقیق مباحث اور اصطلاحوں کی تشریح کی ہے، جن سے کتاب کا تار و پود تیار ہوا ہے تاکہ ہر شخص مندرجہ مطالب کو آسانی سے سمجھ سکے۔

قیمت، حصہ اول: ۹ روپے — حصہ دوم: ۸ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com